

تعارف کتب

عمر فاروق اعظمؓ کسی ذات کی صداقت اور عظمت پر بہت سی دوسری شہادتوں کے علاوہ ایک شہادت عام طور پر یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ اُس کے فلاں فلاں قسم کے اور بچے انسان پیدا کیے ضرور کائنات محمد رسول اللہؐ اس باب میں بھی تاریخ انسانی میں اپنی مثال آپ ہیں کیونکہ حضورؐ نے جن خوش نصیب انسانوں کی تربیت فرمائی، انسانیت ان کی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ انہیں پاکبازانہ خوش بخت ہستیوں میں ایک ہستی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بہت نبوت کا اعجاز دیکھیے کہ جو شخص گھر سے رسالتاب کا سر مبارک لینے کے لئے نکلتا ہے وہ آٹا ٹاٹا ان کا ایک پرسوز ندائی اور جانثار خادم بن جاتا ہے۔ ایک ایسا خادم جو زندگی کے آخری سانس تک اپنے آقا کی اتباع اور چاکری کو ہی اپنی حیات کی سب سے قیمتی متاع سمجھتا رہا۔

زیر تبصرہ کتاب اسی بطل جلیل کی داستانِ حیات ہے۔ اس داستان کو مصر کے مشہور محقق محمد حسین مہیکل نے بڑی محنت اور دیدہ وسی سے مرتب کیا اور اب حبیب اشعر صاحب نے نہایت عمدہ طریقے سے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

ہیکل صاحب مسلمانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے جدید نظریات، وافکار سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ اُن کی پہلی تحریریں اس بات کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں عمر کے آخری سالوں میں اُن میں دینی نقطہ نظر سے خوشگوار انقلاب پیدا ہوا اور انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح مرتب کیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اُن کی وسعتِ نظر، بے لاگ تنقید اور نکتہ رس و ہن کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی جو تبصرہ نگار نے محسوس کی ہے وہ اس کے نقطہ نظر کی صحت ہے مسلمانوں کے ہاں جو جدید سوانح نگار پیدا ہوئے ہیں اُن کی تحریروں کے اند باکل

غیر شعوری طور پر اُس زہر کے اثرات آجائے ہیں جو اہل مغرب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہ کے متعلق پھیلا رکھا ہے۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان سب غلط اثرات کا پوری طرح جائزہ لیں۔ ہم صرف اُن کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہل مغرب بڑی چالاکی اور عیاری کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس غلط خیال کی ہمیشہ سے آبیاری کرتے رہے ہیں کہ ملت اسلامیہ نے اول تو کوئی قابلِ قدر ترقی نہیں کی اور اگر کچھ کی بھی ہے تو یہ محض چند فتوحات تھیں جو صرف دو چار اشخاص کی قوتِ عمل کی رہیں منت ہیں۔ اس قوم نے نہ تو دنیا کو کوئی اقدارِ حیات دیں اور نہ ہی اس نے فکر و نظر کے زاویے بدلے ہیں۔ ایک جوش اور ہیجان تھا جس نے دنیا کے ایک حصہ کو دینی طور پر زیر و زبر کر دیا۔

اس غلط خیال کی تردید نہ اشاعت کے ڈھنگ بھی بُرے ہی دلچسپ اور زلے ہیں اور اُن میں سب سے کامیاب یہ ہے کہ مسلمانوں کی کسی قابلِ احترام شخصیت کو لے لیا جائے اور پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اُس نے جو کچھ کیا وہ کسی فکر و نگاہ کی تبدیلی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اُس شخص کی اپنی ذاتی قابلیت، ذہانت اور فطانت کا اثر تھا۔ اسلام کی ترقی اس طرح محض ایک اتفاقی واقعہ بن کر رہ جاتی ہے اور اسلام نے ذہنوں کے اندر جو انقلاب پیدا کیا ہے۔ اہل دنیا کو جو صحت بخش اقدارِ حیات دی ہیں، لوگوں کے سوچنے اور غور کرنے کے جو انداز تبدیل کیے ہیں اُن کی اہمیت نظروں سے غیر محسوس طور پر اوجھل ہونے لگتی ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے مغربی ذہن جو دو بڑی شخصیتیں سامنے لاتا ہے اُن میں ایک حضرت عمر فاروقؓ ہیں اور دوسرے حضرت خالد بن ولیدؓ۔ چونکہ ان دو خادمانِ دین کے لیے مسلمان اپنے دلوں میں غایت درجہ احترام اور جذباتِ سپاس گزاری رکھتے ہیں۔ اور ان کی دینی خدمات بھی مستحکم ہیں اس لیے ان کی تعریف کرتے ہوئے نہایت عیاری کے ساتھ دلوں پر یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ اسلام کو جو عروج نصیب ہوا وہ صرف انہیں دو سستیوں کی وجہ سے تھا ورنہ اسلام میں خود کو ان کوششیں ایسی نہیں جو دلوں کو مسخر کر سکے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تلوار نے سلطنتوں کو

منزگوں کیا اور حضرت عمرؓ کے غم و فراست نے ایک نظام اجتماعی کی بنیاد رکھی۔ یہ دامنِ انسا ہرنگِ زمیں ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لوگ اس کے فریب میں آگئے یہاں تک کہ علامہ شبی مرحوم جیسے بالغ نظر اور صاحبِ فکر انسان کی شہرہ آفاق تصنیف "الفاروق" پر بھی اس غلط نظریہ کی پرچھائیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اور یوں نظر آتا ہے کہ وہ بھی اپنے ذہن کو اس باطل خیال سے پوری طرح محفوظ و مامون نہ رکھ سکے۔

ہماری اس گزارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم صاف اللہ حضرت عمر فاروق یا حضرت خالد بن ولید کی عظمت کے قائل نہیں، یا ہم انہیں اُس بلند مقام سے جو ہادی برحق نے عطا فرمایا ہے فروتر سمجھتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم ان دونوں حضرات کی بندگی اور دینی خدمت کو اُسی طرح مانتے ہیں جس طرح کہ ایک مسلمان کو ماننا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ان حضرات کی تعریف و توصیف فرمائی ہے وہ بھی پوری طرح ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ان سے بغض و حسد بہاری نگاہ میں اسلام اور رسالتِ مآب سے دشمنی کے مترادف ہے۔ پھر تاریخی نقطہ نظر سے بھی یہ تسلیم ہے کہ انہوں نے مسلمانوں اور خود انسانیت پر جو احسانات کیے ہیں اُن سے نہ تو قلتِ اسلامیہ سبکدوش ہو سکتی ہے اور نہ ہی آدمیت انھیں کبھی مچلا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق نے جو کچھ اس دنیا میں دین کی سرمدی کے لیے کیا وہ اُن کی ذاتی قابلیت یا ذہانت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اُس فیض کا اثر تھا جو حضور کی جوتیوں کے طفیل انہیں حاصل ہوا۔ پھر جس فیض سے انہیں حصہ ملا، اُسی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ اور بے شمار دوسرے صحابہ بھی نوازے گئے۔ حضرت عمر فاروق اعظم اس معاملے میں نہایت تھے بلکہ حضور نے انسانیت کے جو نہایت ہی ادنیٰ نمونے پیدا کیے اُن میں ایک وہ بھی تھے۔ اس لیے جو شخص اس مرد حق آگاہ کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ منبعِ فیض یا اس کے دوسرے رفقاء کی اہمیت کم ہو جائے وہ درحقیقت اسلام پر مسلمانوں پر اور تاریخِ انسانی پر ایک ظلم کا ارتکاب کرتا ہے

محمد حسین سیکل اس اعتبار سے کامیاب ہیں کہ انہوں نے اس چیز کو پوری طرح پیش نظر رکھا۔ حضرت فاروق اعظم کی سیرت بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس امر کی اچھی طرح مراحت کی ہے کہ انہیں جو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی وہ محض حضور سرور کائنات اور ان کے حیل انقدر رفیق حضرت ابوبکر صدیق کی اتباع اور پیروی کا صدقہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد فاروقی اسلام کا اہم ترین دور تھا جس میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، حکومت کا نظام مرتب کیا گیا اور مصر کے علاوہ ان دور کے ممالک پر بھی اسلام کا پرچم لہرایا جو روم اور ایران جیسی باجیروت سلطنتوں کے لیے سرمایہ تازش و افتخار تھے۔ بایں ہمہ حضرت عمر کا عظیم الشان عہد خلافت، عہد صدیقی کا مہربن اور اس کا ختمہ ہے جس طرح عہد صدیقی عہد رسالت کا احسان مند اور اس کا مکملہ ہے“ (ص ۲۸)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف فرماتے ہیں:

”اسلامی سلطنت کی تعمیر عقیدے نے کی۔ یہ عقیدہ بخشہ والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپ ہی نے اس عمارت کی ٹھوس بنیاد رکھی۔ آپ کے بعد آپ کے رفیق اور جان نثار حضرت ابوبکر صدیق نے اس عقیدے سے بغاوت کرنے والوں کا قلع قمع کر کے اور اہل عرب کو عراق و شام کی حدود میں پہنچا کر اسلامی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ حضرت صدیق کے بعد حضرت عمر نے اس عمارت کو مکمل کیا اور اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے چھوڑ گئے“

کتاب کا یہ پہلو بہت روشن ہے اور اس کے لیے فاضل مصنف مبارک بار کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کو اس معاملہ میں اثر انداز ہونے نہیں دیا لیکن ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جو شخص کتاب کے ایک حصے میں اس بات کا دعویٰ کرے کہ حضرت عمرؓ کی کامیابی کا راز حضور سرور کائناتؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی میں مضمر تھا

وہ کیونکہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر بحث کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ نقطہ نظر پیش کرتا ہے جو اس کی بالکل ضد ہے۔ چنانچہ عراق کی زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ نے جو فیصلہ صادر فرمایا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ جاتا ہے:

”انہوں نے اپنی اسی رائے کے سلسلے میں کتاب و سنت کے کسی حکم کا نہیں بلکہ مملکت اور اس کی سیاست کے عام مفاد کا سہارا لیا تھا اور اس اعتبار سے یہ حضرت عمرؓ کی ایک اجتہادی رائے تھی“

اس سے زیادہ واضح نفاذ کی اور کیا مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ ایک ہی شخصیت کی ایک وقت میں عظمت نبی آخر الزمان کی اطاعت و فرمانبرداری میں سمجھی جائے۔ اور دوسرے وقت میں اُس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اُس نے دفنی مصلحتوں اور عصری تقاضوں کے پیش نظر قرآن و سنت کی تعلیمات سے انحراف کیا۔ مغرب کا یہی جادو ہے جو سر چرچہ کہہ رہا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو جو کچھ ملا وہ صرف بارگاہِ نبوت کی کرم فرمائی تھی اور اگر مبداء فیض سے وہ فیض یاب نہ ہوتے تو ان کی حیثیت ایک اونٹ چرانے والے سے کچھ زیادہ نہ ہوتی۔ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ یہ اسی مقدس ذات کی خود اپنے متعلق رائے ہے جسے بعض عقل کے اندھے سنتِ رسولؐ کا منکر ٹھہرتے ہیں۔ یہیں افسوس ہے کہ محمد حسین بیگل سے بھی اس باب میں بعض انتہائی افسوسناک فروگزشتیں ہوئی ہیں۔ اُن جیسے محقق سے یہیں بجا طور پر یہ توقع تھی کہ جس طرح انہوں نے نبیات کے بارے میں مواد کے تلاش کرنے میں انتہائی محنت سے کام لیا ہے اس سے کہیں زیادہ محنت وہ اس کام پر صرف کرتے اور بعض انجان لوگوں کے سطحی نظریات اور خیالات کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہ پانے دیتے۔ اُن کی نظر سے وہ ہدایات بالقرآن و گزری ہوئی گی جو حضرت فاروقِ اعظمؓ مکتبِ اسلامیہ کو وراثتاً روانہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ سے سنتِ رسولؐ کے بارے میں اُن کا موقف پوری وضاحت کے ساتھ سامنے

آجاتا ہے :

اِذَا حَضَرَكَ اَمْرٌ لَا اُذْنٌ مِنْهُ
فَانْظُرْ مَا فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَاَقْضِ يَه
فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فَيَمَّا قَضَىٰ بِهٖ الرَّسُوْلُ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ
فَيَمَّا قَضَىٰ بِهٖ الصَّالِحُوْنَ وَاَعْتَهُ
الْعَدْلُ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ فَاَجْتَهِدْ بِرَأْيِكَ

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹۸)

جب تمہارے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آئے
جس میں رائے دینا ضروری ہو تو سب سے پہلے کتاب
اللہ میں اس کا حکم تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ
کرو۔ کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو پھر سنت
نبوی کے مطابق فیصلہ کرو، اگر سنت نبوی بھی
خاموش ہو تو صلوا را و رائے عدل نے اس طرح
معاملہ میں جو فیصلہ کیا ہو اس کو سامنے رکھو، اگر
یہ بھی نہ ہو تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

سنت رسول کے بارے میں جو شخص بنیادی پالیسی یہ رکھتا ہو اور اس بات کے لیے کوئی مثال
ہو کہ حکومت کے کاغذ سے اسی پالیسی کو امور مملکت چلانے کے لیے عائد بنائیں اُسے سنت
رسول کا منکر ثابت کرنا بہت بُری جبارت ہے۔

سودا و عراق کی زمینوں کا بند و بست، طلاق ثلاثہ اور مؤلفۃ القلوب، یہ تین چار مسائل
ایسے ہیں جنہیں ہر منکر حدیث اس بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے فتویٰ
تفانصوں کے پیش نظر سنت کے احکام کو پس پشت ڈال دیا اس لیے ہر صاحبِ امر کو یہ اختیار
ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے جس ثابت شدہ اسلامی حکم کو چاہے بدل دے مگر یہ صورت حال
کا نہایت سطحی مطالعہ ہے اور محمد حسین مہکبل جیسے محقق کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بھی بغیر
تحقیق کے ان باتوں کو قبول کر لیں۔ ان مسائل کے بارے میں سلف اور خلف دونوں نے بہت
کچھ لکھا ہے۔ سودا و عراق کی زمینوں کی تقسیم کے سلسلہ میں جو اختلاف رائے ہوئے اور جس طرح
اس کا تصفیہ ہوا اُس کی تفصیلات فاضل ابوبکر سیف کی کتاب الخراج میں پوری طرح ملتی ہیں
جو شخص ان کو پڑھ لے وہ کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ سودا و عراق کی زمینوں کے بند و بست،

میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی اجتہاد کو قرآن کی ہدایات یا اسوہ نبوی پر ترجیح دی۔ یہی حال طلاق ثلاثہ اور مؤلفہ القلوب کا بھی ہے۔ ان مسائل کا بھی اگر گہرائی میں اتر کر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں کوئی چیز بھی قرآن و سنت کے خلاف نہ تھی بلکہ ان مسائل کو احکام الہی اور اسوہ رسول کی روشنی ہی میں حل کیا گیا۔

اس کے علاوہ کتاب کا ایک اور افسوسناک حصہ وہ ہے جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جدید قوم پرستی کا موستس ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محمد حسین سبیل صاحب پر چونکہ خود قوم پرستی کا بھوت سوار ہے اس لیے انہوں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس میں ملوث کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

• اسلام نے جو اجتماعی نظام جاری کیا۔ وہ مدد عانی نظام کی طرح سادہ تھا چنانچہ اس کا بھی عربوں کی جماعتی وحدت پر وہی اثر ہوا تھا جتنا مدد عانی نظام کا تھا اور اسے حضرت ابوبکرؓ کا ارتداد کی جنگوں میں فتح یاب ہونا اس بات کی قطعی دلیل تھی کہ توحید کے اصول عربوں کے دل میں راسخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مدعیان نبوت میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ وہ لوگوں کو بت پرستی اور تدیم جاہلیت کی طرف بلا رہے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر و انصار صحابہ میں سے جن بزرگوں نے اصول توحید کی پیروی کی اور اس کے لیے اپنی جانیں وقف کر دیں ان پر کوئی غالب نہ آ سکا۔ یہی ایک نقطہ ہے جس سے وحدت عرب نے نہایت تیزی کے ساتھ ثبات و استحکام کی طرف قدم بڑھایا۔

پھر اس کتاب کے اندر وہ توازن بھی مفقود ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کی اپنی زندگی میں نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، ایک عام تاثر جو ان کی شخصیت کے لیے سواد کی زمینوں اور طلاق ثلاثہ کے متعلق ہم ترجمان القرآن جلد ۵۰ عدد ابابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۵ء میں بحث کر چکے ہیں